Fikr-o-Nasar (Islamabad) 13:8 (1976)
© rasailojaraid.com

سر سیّد کی قومی تحریک

(ایک طائرانہ نظر)

شرف الدین اصلاحی

سیاسی وسماجی پس منظر

انیسویں صدی کا نصف اوّل جس میں سر سید پیدا ہوئے مسلم ہندستان کی تاریخ کا بدترین زمانہ تھا۔ مسلمانوں کا شاندار ماضی حال کی پستی سے بدل رہا تھا۔ زوالِ امّت کے اسباب جن کی تکمیل تقریباً ایک صدی سے ہورہی تھی اس دور میں اپنی انتہا کو پہنچ گئے۔ مسلمان سیاسی اعتبار سے دن بہ دن بے بس ومجبور ہوتے گئے اور انگریز اپنی حکمتِ عملی سے ملک کے در وبست پر آہستہ آہستہ قابض ہوتے گئے۔ مشرق ومغرب کی آویزش کا جو ڈرامہ سرزمینِ ہند میں کارکنانِ قضا وقدر اسٹیج کر رہے تھے، اس کا خاتمہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے غلبہ وتسلط پر ہوا۔ مسلمان ہندوستان پر سات سو سال حکومت کرنے کے بعد اب ایک اجنبی اقتدار کے محکوم تھے۔ ان کی آزادی غلامی سے بدل گئی، ان کے بادشاہ فقیروں سے بدتر ہوگئے۔ یہ انقلاب محض حکومت کا بدلنا نہ تھا۔ یہ ایک قوم کی مکمل تباہی وبربادی کا المیّہ تھا۔

غدر کے بعد قوم کی عبرت ناک حالت کا نقشہ حالؔی نے اپنی ایک تقریر میں پیش کیا ہے۔ یہ تقریر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بارھویں اجلاس منعقدہ ۱۸۹۹ء میں کی گئی:-

"صاحبو! اگرچہ ہماری قوم کا میلان ایک عرصۂ دراز سے روز بروز پستی کی طرف ہوتا جاتا تھا۔ ان کی تمام خوبیاں آہستہ آہستہ مٹتی جاتی تھیں۔ علم میں، دولت میں، اخلاق میں، درجہ میں وہ اپنی ہموطن قوموں سے گرتے جاتے تھے۔ مگر یہ پستی اور تنزل بظاہر چنداں محسوس نہ ہوتا تھا۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء میں غدر کی آندھی اٹھی جس نے اس ٹمٹماتے چراغ کو بالکل بجھا دیا۔ یکایک مسلمانوں کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ چند گھرانے جو کسی قدر نام ونمود رکھتے تھے ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئے اور ہزاروں معرکۂ بغاوت میں مارے گئے اور ہزاروں جانیں دوسروں کے لئے عبرت کا سبق دینے میں کام آئیں۔ ہزاروں اپنا وطن

اور شہر و دیار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں رُوپوش ہو گئے اور جو باقی سب سے تھے ان کا یہ حال تھا کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ گھر چھن گئے۔ جائدادیں ضبط ہو گئیں۔ بڑے بڑے عالی خاندان فقیر ہو کر تکیوں میں جا بیٹھے۔ بہت سے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ یا باورچی گیری اور خدمت گاری کرتے تھے، مشکیں اُٹھاتے تھے، گاڑیاں ہانکتے تھے۔" (مقالاتِ حالی جلد دوم۔ صفحہ ۳۴۴)

مسلمانوں میں وہ تمام نقائص عرصہ سے پیدا ہو چکے تھے جو کسی قوم کو محکوم و غلام بنانے کا سبب ہوتے ہیں۔ لیکن نام کی حکومت پردہ ڈالے ہوئے تھی۔ غدر میں حکومت کا کلیتہً چھن کر انگریزوں کے ہاتھ میں جانا تھا کہ مسلمان ادبار و فلاکت کے اس قعرِ مذلت میں جا پڑے جس سے نکلنے کی بظاہر کوئی امید نہ تھی۔ اخلاقی بیماریاں ان میں عرصہ سے گھر کر چکی تھیں۔ تہذیب و تمدن میں صرف باپ، دادا کا نام رہ گیا تھا۔ علوم و فنون، تعلیم و تربیت میں زمانہ کی رفتار سے صدیوں پیچھے جا پڑے تھے۔ مذہب جو کسی زمانہ میں ان کی تمام علمی و اخلاقی، تہذیبی و تمدنی، دینی و دُنیاوی، انفرادی و اجتماعی ترقیوں اور سیاسی فتح مندیوں کا ذریعہ تھا اور جس کی بدولت وہ خیر الامم کے معزز لقب سے سرفراز ہوئے تھے اس کا چشمۂ صافی اوہام و خرافات کی آلودگیوں اور خود ساختہ رسم و رواج کی کثافتوں سے گدلا ہو کر ان کے حق میں سب سے بڑا مانعِ ترقی بن گیا تھا۔ دقیانوسیت اور قدامت پرستی کے شکنجوں میں وہ اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ کوئی نئی چیز ان کی نظر میں شرک اور کفر سے کم نہ تھی۔ جہل و سفاہت، تعصب و تنگ نظری نے آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی تھیں۔ کاہلی اور سستی، آرام طلبی اور سہل پسندی تو گویا مسلمانوں کا قومی نشان تھا۔ سلطنت جانے کے بعد افلاس نے جو ام الخبائث اور ام الجرائم ہے گھر گھر ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ غرض قوم پر وہ وقت آن پڑا تھا کہ مایوسی، بددلی اور بے حسی کے گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں پوری قوم آوارہ و سرگشتہ تھی اور اس سے نکلنے کی تمام راہیں مسدود نظر آتی تھیں۔ نہ راستے کا نشان تھا نہ منزل کا پتا نہ کارواں تھا نہ میر کارواں۔ جمعیت پراگندہ ہو چکی تھی۔ شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ افراتفری، ابتری اور بدنظمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی۔ قُفل پٹ چکے تھے اور لٹنے کا احساس تک نہ تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مردے از غیب

قانونِ قدرت ہے کہ بگاڑ جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اصلاح کی قوتیں حرکت میں آکر بناؤ کا سامان کرتی ہیں۔ مردے از غیب آید کارے بکند۔ ۱۸۵۷ء ہندی مسلمانوں کی قومی تاریخ کا ایک ایسا ہی موڑ تھا۔ حالات نے سرسید کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھیں۔ سرسید پہلے تو ہمہ گیر تباہی کے دردناک منظر کی تاب نہ لا سکے۔ انہوں نے ترکِ وطن میں عافیت محسوس کی۔ حالات واقعی روح فرسا اور ہمت شکن تھے۔ مگر قدرت کو ان سے کام لینا تھا۔ ہندوستان میں مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کا بیڑا اٹھانے کے لئے ان کا انتخاب ہو چکا تھا۔ ان کو غیرت آئی کہ قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر کہیں جانا جوانمردی کے منافی ہے۔ انہوں نے وقت کا چیلنج قبول کر کے قوم کی حیاتِ نو کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کا تہیہ کیا اور میدانِ عمل میں کود پڑے۔ وہ اپنے خود نوشت حالات میں لکھتے ہیں:

"غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔ اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا۔ اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مرادآباد میں آیا۔ جو ایک بڑا غمکدۂ بربادی ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا اس غم کو کسی قدر تسلی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

(دیباچہ لکچروں کا مجموعہ۔ مرتبہ منشی سراج الدین۔ ۱۸۹۰ء)

غدر نے سرسید کی طبیعت کے ساتھ وہی کام کیا جو بجلی گرنے کے ایک واقعے نے

وتھر[1] کے ساتھ کیا تھا۔ مگر لوتھر کی ریفارمیشن اور سرسید کی قومی تحریک میں بعدالمشرقین ہے۔ جو نسبت ایک شخص کی جان لینے والی بجلی اور ایک ملک کے ویران کر دینے والے غدر میں ہے وہی نسبت لوتھر اور سرسید کے کاموں میں ہے۔

سرسید کے رفقائے کار

سرسید کو قدرت نے جس بڑے کام کے لئے پیدا کیا تھا وہ تنہا ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا۔ خدا جب اپنے کسی بندے کو کسی کام پر مامور فرماتا ہے تو اس کے لئے ویسے ہی حالات و اسباب پیدا کرتا ہے حالات کا تقاضا تھا یا قومی نصب العین کی کشش یا سرسید کی مقناطیسی شخصیت کا اثر۔ کہ یکایک ایک زمانہ رفقاء کی ایک جماعت ان کی ہمسفر ہو گئی۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک، وقارالملک، منشی ذکاءاللہ، مولوی چراغ علی، عزیز مرزا، عثمان فارقلیط۔ اس نظام شمسی کے تابندہ ستارے ہیں جن کا محور سرسید کی ذات تھی۔ سرسید کی خوش قسمتی تھی جو انہیں ایسے لائق اور فائق ہستیوں کا حلقۂ احباب مل گیا۔ سرسید کے مشن کی کامیابی کے اسباب میں ایک اہم سبب ان کے اعوان و انصار کا دست تعاون تھا ان میں سے ہر شخص سرسید سے متاثر ہوا۔ اور ان سب سے سرسید نے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیا۔

تحریک کی ہمہ گیری

سرسید کے مشن میں اصلاح قوم کا تصور اتنا وسیع اور جامع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرۂ اثر سے خارج نہیں۔ انفرادی سیرت و کردار، اجتماعی معاملات و مسائل، عام علم و اخلاق، تہذیب و شائستگی، تعلیم و تربیت، مذہب ادب، سیاست، تمدن غرض جملہ امور دین و دنیا میں وہ مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے خواہاں تھے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ بات میں وہ چاہتے تھے کہ ان کی قوم شاہی کیرکٹر کی حامل ہو۔

---

[1] وتھر سولھویں صدی میں عیسائیت کا ایک بہت بڑا ریفارمر گزرا ہے۔ وہ قانون اور لٹریچر کا طالبعلم تھا۔ ایک روز اس کا ساتھی بجلی گرنے سے آناً فاناً اس کے سامنے ہلاک ہو گیا۔ اس واقعے نے اس کی طبیعت پر ایسا اثر کیا کہ اس نے دنیا چھوڑ کر دین کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملکی قانون، قومی مسائل، داخلی اور خارجی حالات پر ان کی نظر یکساں اور بیک وقت تھی۔ تہذیب الاخلاق میں انہوں نے جہاں "تعلیم و تربیت"، "آزادئ رائے"، "خیر دائم"، "تربیتِ اطفال"، "غلامی"، "عورتوں کے حقوق"، "طریقۂ زندگی"، "کاہلی"، "سمجھ"، "امید کی خوشی"، "ریا"، "خوشامد"، "بحث و تکرار"، "سویلزیشن"، "آپ ہی ملدا آپ"، "زمانہ بڑا اصلاح کرنے والا ہے"، "نامہذب ملک اور نامہذب گورنمنٹ"، جیسے اہم تعلیمی، سیاسی، مذہبی و اخلاقی عنوانات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ وہاں ادب، شاعری اور زبان کے سلسلے میں انہوں نے خط و کتابت، املا، توسیع زبان اور علامات وقف تک کو نظر انداز نہیں کیا۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین کے علاوہ انہوں نے جتنی مستقل تصانیف اور متفرق رسالے لکھے، خواہ ان کا موضوع کچھ ہو، ان سب میں قومی اصلاح کا مقصد نمایاں ہے۔ غرض سرسید کی تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی۔ وہ بحیثیتِ مجموعی مسلمانوں کی ترقی کے طالب تھے۔ اس لئے قومی زندگی کا ہر وہ پہلو جو کسی اعتبار سے بھی اصلاح طلب تھا ان کی توجہ کا مرکز اور ان کے نصب العین کا حصہ بن گیا۔

سرسید کی تحریک کو مختلف نام دیئے گئے ہیں کسی نے اسے تعلیمی تحریک کہا۔ کسی نے مذہبی تحریک بتایا۔ کسی نے اس کا مقصد اصلاحِ معاشرت قرار دیا اور کسی نے سیاست کو اس کا مرکز و محور ٹھہرایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام جزوی نام ہیں جو اپنے محدود مفہوم میں تحریک کے کسی ایک پہلو کو ظاہر کرتے ہیں۔ تحریک کی جامعیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب نام جو اس کے تمام پہلوؤں کو محیط ہو صرف "قومی تحریک" ہی ہو سکتا ہے۔ جس کے تحت تعلیم، سیاست، مذہب، معاشرت، معیشت اور ادب سبھی آجاتے ہیں۔

تحریک کا اصل الاصول

سرسید کی تحریک کا خلاصہ یہ ہے کہ جب زمانہ بدلے تو تم بھی بدل جاؤ۔ یہی وہ بنیادی نقطۂ نظر ہے جس کے تحت انہوں نے ہندی مسلمانوں کی قومی زندگی میں اصلاح کی کوشش کی۔ جدید علوم و فنون کی تعلیم کا منصوبہ انہوں نے اسی غرض سے پیش کیا۔ مغربی تہذیب و آدابِ معاشرت کی پیروی کا مشورہ قوم کو انہوں نے اسی لئے دیا۔ مذہب کی نئی تعبیر کی ضرورت انہوں نے اسی لئے محسوس کی۔ سیاست میں اندازِ فکر بدلنے کا مشورہ بھی اسی پر مبنی تھا۔ معیشت میں نئی راہوں کی تلاش کا احساس اسی لئے دلایا۔ ادب اور شاعری میں مغرب سے استفادہ کی تلقین اسی لئے کی کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ وقت کے تقاضے

کچھ اور ہیں۔ تمہارا قدیم سرمایۂ علم و ادب بیکار آمد نہیں۔ اُٹھو اور نئی دنیا کی تعمیر کرو۔

سماجی شعور

اس سے پہلے بھی مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً اصلاح و تجدید کی تحریکیں رونما ہوتی رہیں اور سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل رحمہما اللہ کی تحریک کا زمانہ تو بہت قریب کا تھا۔ لیکن ان تحریکوں پر روحانی اور مذہبی رنگ غالب تھا۔ قوم، قومیت اور سماج کے عام دنیاوی تصورات کو سب سے پہلے سرسید نے روشناس کرایا۔ روشناس ہی نہیں کرایا تکرار اور کثرتِ استعمال سے ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں ملک، وطن اور قوم کے مسائل پر اجتماعی نقطۂ نظر سے سوچنے کے رجحانات نے پرورش پائی۔ اردو ادب تو سرسید سے پیشتر اس قسم کے مباحث سے بالکل ناآشنا تھا۔ ادب کو شعوری طور پر ایک مقصد اور نصب العین کے تحت زندگی کا ترجمان بنانا لوگوں کو سرسید نے سکھایا۔

سرسید کے افکار و خیالات میں بحث و نظر کی بڑی گنجائش ہے۔ خاص کر ان کے مذہبی رجحانات اور سیاسی نظریات پر بڑی رد و قدح ہوتی رہی ہے۔ مگر اس حقیقت سے مجال انکار نہیں ہے کہ سرسید کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا اور وہ اپنے مشن میں مخلص تھے۔ انہوں نے جو کچھ سوچا مسلمانوں کی بھلائی کے لئے سوچا۔ اور جو کچھ کیا مسلمانوں کی بھلائی کے لئے کیا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ان کی پالیسیاں بحیثیتِ مجموعی نتیجے کے اعتبار سے مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہوئیں یا مضر لیکن ہم انہیں مسلمانوں کا بد اندیش اور بدخواہ نہیں کہہ سکتے۔ ان کی قومی تحریک کا جو خالصتہً مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے لئے تھی اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تحریک میں خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی بات جو کچھ لوگوں کی نظر میں اچھی ہو دوسروں کی نظر میں اچھی نہ ہو۔ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ سرسید اپنے کام میں مخلص نہ تھے۔ سرسید کی قومی تحریک کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت ہمیں ان حالات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جن میں اس تحریک نے جنم لیا۔ آج حالات یکسر مختلف ہیں۔ صحت مند تعمیری تنقید کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس وقت کے حالات اور ماحول کو نگاہ میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ سرسید بھی ہماری آپ کی طرح ایک انسان تھے۔ فکر و عمل میں ٹھوکر کھانا انسان کا بشری تقاضا ہے۔

© rasailojaraid.com